مصنفہ

جناب منشی گورکھ پرشاد صاحب عبرت (مرحوم)
گورکھپوری

مطبوعہ

ایوان اشاعت گورکھپور
قیمت غیر مجلد ۱۲ ر

مقدمہ

جناب منشی گورکھ پرشاد عبرت مرحوم نہ صرف ایک شاعر ماہر تھے بلکہ گورکھپور کے مشہور ذی عزت اور سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے اور اپنے علم و فضل کی بدولت اہل شہر میں خاص عزت اور وقار رکھتے تھے - انکی زندگی کے مختصر حالات یہ ہیں:

"ضلع گورکھپور کے ایک دیہات بنوارپار میں پیدا ہوئے - انکے مورث اعلیٰ شیر شاہ کے وقت میں آکر اس گانوں میں بسے تھے اور جب سے یہ خاندان یہیں رہا اور پھیلا - موصوف نے ابتدا میں عربی فارسی کی تعلیم گورکھپور کے مشہور عالم مولوی صادق علی سے پائی جو اپنے زمانہ کے بہت بڑے فاضل و متبحر مانے جاتے تھے -

حضرت عبرت فطرتاً ذہین تھے اور خدا داد ذہن رکھتے
تھے۔ استاد کو بہت جلد معلوم ہو گیا اور ان کو حضرت عبرت
کے ساتھ خاص انس پیدا ہو گیا جو عمر بھر باقی رہا۔ علم و ادب کا
ذوق چونکہ خمیر میں تھا اس لئے انھوں نے بہت جلد عربی و
فارسی میں پوری دستگاہ حاصل کر لی۔ ذہانت کا اندازہ یوں
کیا جا سکتا ہے کہ عربی و فارسی سے فارغ التحصیل ہونے کے
کچھ روز بعد صرف دو سال کے مطالعہ کے بعد حضرت عبرت
نے انگریزی مڈل سکول کا امتحان پاس کر لیا اور فوراً
ڈاک خانہ میں ملازمت کر لی۔

شعر و سخن کا شوق بچپن سے تھا۔ چنانچہ دوران
طالب علمی سے [illegible]۔ فارسی میں شعر [illegible]

اور اردو میں غالب سے خاص دلچسپی تھی۔ خود آزاد اور
حالی کے معاصر تھے۔ اور ان کے کلام پر زیادہ تر انھیں
معاصرین کا اثر غالب ہے۔ غزلیں بھی کہیں، نظم بھی حضرت
عبرت پر کچھ لکھتے ہیں مخصوص گر غیر شعوری عروض و قا
نون لیے ہوئے لکھتے ہیں اور ایک مخصوص انداز اور داوے
کے ساتھ لکھتے ہیں۔

ان کی ایک مشہور نظم "مسدس شکوہ" کے نام سے
غالباً ابھی کہیں چھپ چکی ہے اور مقبول ہو چکی ہے۔ نظم
کی امتیازی خصوصیات اس کی روانی اور سلاست زبان کی
ہیں اور اسکو پڑھنے سے شاعر کی قدرت بیان کا پتہ چلتا
ہے۔ اس کے علاوہ دو تین مختصر مختصر نظمیں اور بھی

ہیں اور سب کی سب اچھوتی اور طبعزاد ہیں۔ طرز اور اسلوب پر ضرور حالی آزاد اور اسمٰعیل کا رنگ غالب ہے۔ لیکن جہاں تک موضوع کا تعلق ہے شاید حضرت عبرت کی ہر نظم اپنی جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ اور اس معاملہ میں وہ کسی کے محتاج کبھی نہیں رہے۔ ان کا ہر شاعرانہ خیال اُنکی ذاتی اور فطری اُپج کا نتیجہ ہوتا تھا۔

غزلوں کے چند منتخب اشعار یہاں مثالاً پیش کئے جاتے ہیں جن سے حضرت عبرت کی فصاحت و بلاغت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا

"دل آیا اپنا قابو میں گئیں سب وحشتیں دل کی
مزا آنے لگا اب ہم کو ویرانے میں بستی کا"

۵

"کہیں وہ بھی نہ نا اُمیدی ہو

جس نے ہم کو اُمیدوار کیا"

"ہم کو اکسیر ہے تو ہی اے خاک

لاکھ ہو آسماں سے کیا مطلب؟"

"زندگی خود ہے ایک ہنگامہ

عالمِ رفتگاں سے کیا مطلب؟"

"کل خدا جانے کہ کیا ہونیکو ہے

آج بھاری رات ہے بیمار پر"

"خوب ہے اے دل یہ اپنا غمکدہ

غیر کی بزم طرب کچھ بھی نہیں"

"زمانہ کے ہاتھوں سے چارہ نہیں ہے

زمانہ ہمارا تمھارا نہیں ہے"

"کہیں یہ نہ بدتر ہو یہ صورت

یہ عالم ہمارا آشکارا نہیں ہے"

"کچھ رنگ جما لو تو جوانو! "تا عہد شباب زندگی ہے"

"اے موت کہیں تو اور لے چل دنیا یہ خرابۂ زندگی ہے"

حضرت عجبت کا ہر شعر ایک پیغام ہوتا ہے
جو بڑی نزاکتوں کے ساتھ دوسروں تک پہنچایا جاتا ہے۔
تھی اعتقادات بھی ان کے کلام پر نظر ڈالیے تو زبان کی
سادگی اور نفاست، محاوروں کی شستگی اور برجستگی،
تشبیہات و استعارات کا نیاپن، فارسی الفاظ کا سلیقہ
کے ساتھ استعمال، یہ وہ خصوصیتیں ہیں جو حضرت عجبت
کو ایک باکمال، حسین اور قادر الکلام شاعر ماننے پر مجبور کرتے
ہیں۔ اور ان سب پر مستزاد وہ جوش اور انبساط جو انکی
ہر نظم اور ہر غزل کو دوسروں کے کلام سے نمایاں طور سے
الگ کرتا ہے۔ اور جو صرف انکی اپنی انفرادی شان ہے
کلام کے مجموعی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضر

عبرت مسلسل نظمیں لکھنے کا خاص ملکہ رکھتے تھے۔ چنانچہ انکی کلیات کا بیشتر حصہ مثنوی، مسدس، مخمس وغیرہ پر مشتمل ہے۔ انھیں منظومات میں زیر تبصرہ مثنوی "حسن فطرت" بھی ہے جس کو ۱۸۹۰ء سے کچھ پہلے مصنف نے بمقام لکھنؤ لکھنا شروع کیا۔

حضرت عبرت یوں بھی جو کچھ لکھتے تھے بہت جلد لکھتے تھے اور ایک بار لکھنے کے بعد شاذ و نادر اسے نظر ثانی کرتے تھے۔ لیکن "حسن فطرت" اور بھی زیادہ عجلت میں لکھی گئی۔ ہر ہفتہ میں کم و بیش اتنی اشعار لکھتے تھے جو "طوطی ہند" میرٹھ میں ہفتہ وار شایع ہوتے تھے "حسن فطرت" کی سرخی نے فوراً لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مائل

کرلیا اور جبتک اس کی قسطیں شایع ہوتی رہیں لوگ اسکو
بڑے ذوق اور لطف کے ساتھ پڑھتے رہے۔ تقریبًا ایک
ثلث لکھنا باقی رہ گیا تھا کہ حضرت عبرت نے وکالت کا
امتحان پاس کیا اور گورکھپور میں وکالت شروع کردی۔
اسکے بعد تقریبًا اٹھائیس سال تک انھوں نے کچھ نہیں
لکھا اور وکالت کی مصروفیتوں میں محو رہے۔ گورکھپور
کے وکلا میں وہ سرگروہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور آجتک
اس حلقہ میں ان کا نام عزت و تعظیم کے ساتھ لیا جاتا ہے۔
آخرکار جب ۱۹۱۸ء میں حضرت عبرت کی
تندرستی خطرناک حد تک خراب ہوگئی اور ان کی شاعرانہ
بصیرت نے دیکھ لیا کہ وہ بہت جلد اس دار فانی اور

اس کی نیرنگیوں کو چھوڑنے والے ہیں تو خود بخود ان کے
دل میں حسنِ فطرت کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ مثنوی
کے آخری تقریباً ایک سو پچاس اشعار اٹھائیس سال کے
سکوت کے بعد کے ہیں۔

مثنوی کو ختم کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد موصوف
نے "دہرہ دون" میں انتقال کیا اور اس کی نوبت نہیں آئی
کہ مثنوی پر پھر سرسری طور سے نظرِ ثانی کر لیتے۔

مرحوم کی زندہ اولاد چھ ہیں۔ تین لڑکے اور تین
لڑکیاں۔ تینوں لڑکیاں بیاہی جا چکی ہیں۔ دو لڑکے ابھی
پڑھ رہے ہیں۔ اس وقت سب سے بڑے لڑکے جناب رگھوپتی
سہائے "فراق" ایم اے ہیں جو الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی

ادبیات کے لکچرار ہیں۔ خاندان کی تمام ذمہ داریاں انھیں کے سر ہیں اور یہی متعلقین کے کفیل ہیں۔

فراقؔ صاحب شعر و سخن کا بڑا اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ خود بھی اردو کے اچھے شاعر ہیں۔ انکے منظومات اکثر اخبار و رسائل میں نکلتے رہتے ہیں اور شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ یہ انھیں کے مذاق شعری کا نتیجہ ہے کہ ان کے والد کا کلام اب تک محفوظ رہ گیا۔ ورنہ اب تک نہ جانے کے من مٹی کے نیچے دب کر مٹی میں مل گیا ہوتا اس لئے کہ گھر میں کوئی دوسرا ایسا نہ تھا جو اسکی قدر کرتا اور اسکو زمانہ کی دستبرد سے بچاتا۔

"حسن فطرت کا انجام غالباً ہلنسی خوشی ہے

ہوتا لیکن چونکہ اسکو ختم ایسے وقت میں کیا گیا جبکہ شاعر کا
دم واپسیں قریب تھا اور دنیا کا طلسم حباب کی طرح ٹوٹنے
والا تھا۔ اس لئے مثنوی بلا ارادہ ایک المنامہ ہو گئی۔
آخری اشعار کے لب ولہجہ سے پایا جاتا ہے کہ مصنف کو
زندگی میں خارج و باطن سے جو تجربات ہوتے رہے ہیں
اور جن آلام و محن سے اُن کو گزرنا پڑا ہے اُنھوں نے
انکے قلب و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے تھے جو زندگی
کے آخری وقت میں اُبھر کر تازہ ہو گئے۔

"حسن فطرت" حضرت عبرت کی اپنی طباعی اور
جودت فکر کا نتیجہ ہے۔ اور اسمیں کہیں سے کسی کے تتبع
کی جھلک نہیں نظر آتی۔ نفس موضوع کے اعتبار سے

تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُردو میں اپنی نوعیت
کی یہ پہلی چیز ہے - اردو زبان میں ایسے تمثیلی قصوں کا رواج
نہیں تھا - یہ پہلی مثنوی ہے جو شروع سے لے کر آخر تک
تمثیل و کنایہ میں لکھی گئی ہے - فنی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو
بھی معلوم ہو گا کہ حضرت عبرت نے فرسودہ رسوم و قیود
سے ایک بڑی حد تک انحراف کیا ہے اور مثنوی نگاری
میں ایک نئی طرح ڈالی ہے "حسن فطرت" میں سب سے پہلی جو
جدت ہم کو نظر آتی ہے وہ اسکی بحر ہے - مثنوی کی مخصوص
بحروں میں یہ بحر نہیں اور شاید ایک آدھ مثنوی کہیں اس
بحر میں ملے - حضرت عبرت نے اس لغو و بے معنی قید کو
توڑا اور اس سے ان کی مثنوی کا حسن صوتی یقیناً بڑھ گیا

عام طور سے جن بحروں میں مثنویاں لکھی جاتی ہیں
ان میں ایک تھکا دینے والی یکسانی اور ایک بے کیف
ہمواری کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مصرعوں میں
کافی اُتار چڑھاؤ نہیں پیدا ہوتا۔ برخلاف اس کے
حسنِ فطرت کے لئے جو بحر منتخب کی گئی ہے اس میں خود
پورا اُتار چڑھاؤ موجود ہے جو ہر مصرعہ میں ایک ترنم کی کیفیت
اور ایک خوش آہنگ لوچ پیدا کرتا ہے۔

ان بیشمار جدتوں کے علاوہ حسنِ فطرت میں
ایک اور نئی بات نظر آتی ہے۔ مثنویوں کی ابتدا عموماً حمد،
نعت اور منقبت وغیرہ سے ہوتی ہے۔ حسنِ فطرت میں آپ
یہ سب کچھ نہیں پائیں گے۔ ایک مختصری تمہید کے بعد کہانی

حیات انسانی سے متعلق بہت کلیات بیان کئے گئے ہیں
اصل قصہ شروع ہو جاتا ہے۔

فنی نقطۂ نظر سے "حسن فطرت" ایک کامیاب مثنوی
ہے۔ مثنوی نگاری کے لئے ضروری ہے کہ جو واقعات
و واردات بیان کئے جائیں وہ خلاف فطرت یا خلاف
عادت نہ ہوں اور ہر واقعہ اور ہر حال کو بیان کرنے کے
لئے جانے اور منتخب الفاظ تلاش کئے جائیں "حسن فطرت"
میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ عام الورود ہے۔ البتہ
مصنف نے اس واقعہ کو تمثیل میں پیش کیا ہے جس نے
مثنوی کی کیفیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ مثنوی نگاری
کی دوسری لازمی خصوصیت بیان کا تسلسل ہے۔ ہر شعر

کو دوسرے مصرعہ کے ساتھ اور ہر شعر کو دوسرے شعر
کے ساتھ ایک علاقہ اور ربط ہونا چاہیئے۔

"حسنِ فطرت" کی ایک نمایاں شان یہ بھی ہے کہ
اسکا ہر مصرعہ پچھلے مصرعہ اور ہر شعر پچھلے شعر کا لازمی نتیجہ
معلوم ہوتا ہے۔ مثنوی کی ایک اور لازمی خصوصیت
کردار نگاری ہے اگر مثنوی کوئی افسانہ ہے۔ مثنوی نگار
کا یہ فرض ہے کہ جس شخص کا واقعہ بیان کرے اُسکی پوری
تصویر آنکھوں کے سامنے اُتار کے رکھدے۔ اور جس موقع
و محل کا واقعہ ہو اُسکو ہو بہو پیش نظر کردے۔ اس لحاظ سے بھی
"حسنِ فطرت" کامل العیار ہے۔ افراد قصہ مثلاً ملکہ روح
دل، شاہزادی حسن وغیرہ کی صورت و سیرت کے نقشے

ی مہارت اور حسن اسلوب کے ساتھ کھینچے گئے ہیں کہ پڑھنے والا ایسا
سوس کرتا ہے کہ وہ ان افراد کی جیتی جاگتی تصویر دیکھ رہا ہے۔
نوی میں اگر کوئی بدعت کی گئی ہے جو کسی حد تک غیر مانوس معلوم
ہوسکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ حضرت سیبک نے جسم کو ایک شہر مانا ہے
ح، دل، حسن وغیرہ کو مشخص کرکے افراد قصہ لکھا ہے لیکن
کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حسن فطرت ایک تمثیلی قصہ ہے
کی دوسری مثال اردو زبان میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ شاعر
نہایت وسیع دل و بلند نظر رکھنے والا تھا جس کی تشفی صرف اس سے
یں ہوسکتی کہ کسی خاص ذات واحد کی داستان عشق و وفا بیان
جائے۔ اور چونکہ طبعاً شاعر تھا اس لئے اس سے یہ بھی نہ ہوسکا
ض چند کلیات بیان کرکے رہ جائے۔ وہ قصہ بھی بیان کرنا
ہتا تھا اور پھر ایسا قصہ بیان کرنا چاہتا تھا جو سارے کائنات کے

نہ سہی تو کم از کم تمام بنی نوع انسان پر صادق آئے۔ اس غرض
کے لئے اس تمثیل سے بہتر کوئی چیز ان کو نہیں مل سکتی اور شاید
مل ہی نہیں سکتی تھی

اب تھوڑی دیر کے لئے "حسن فطرت" کے ذاتی
محاسن و معائب پر بھی نظر ڈال لیجئے۔ پورا قصہ دہرانے کی ضرورت
نہیں صرف جا بجا سے انتخاب کر کے یہ اندازہ کر لینا چاہئے
کہ حضرت عبرت کس مرتبہ کے شاعر تھے اور ان کی مثنوی "حسن فطرت"
کس پایہ کی مثنوی ہے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت عبرت جو کچھ کہتے ہیں وہ
اس بیساختگی بے تکلفی اور سہولت کے ساتھ کہتے ہیں کہ فوراً سننے
والے کے دل میں اتر جاتی ہے کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وزن
و قوافی کے خیال سے کاوش کر کے مضمون موزوں کئے گئے ہیں"

ـہ کے کلام میں بہت کم ایسے مصرعے ملیں گے جن سے آورد کا
ـاس پیدا ہو۔ انکی مثنوی میں بھی یہ خصوصیت نمایاں ہے تمہید کا
شعر سنئے جس سے "حسن فطرت" کی ابتدا ہوتی ہے:-

ـگڑنا بنا حقیقت میں اتفاق پہ ہے
خوشی بشر کی مگر منحصر مذاق پہ ہے

اہم اور دقیق نکتہ کو ہر شخص کو سمجھا دینے کیلئے اس سے
ـل اور اس سے زیادہ دلپذیر اسلوب اور کیا ہو سکتا تھا۔
ـت نگاری ملاحظہ ہو شہر جسم کے متعلق:-

تھا ایک شہر جو بنتا چار عنصروں سے بنا
ـہ چار کون؟ یہی آگ، پانی، خاک، ہوا

ـر کی ملکہ کا نام روح ہے۔ اسکی تعریف میں لکھتے ہیں:-

فنا کی گرد میں ہرچند وہ چھلتی تھی

ہمیشگی کا نگر راستہ وہ چلتی تھی"

اس تعریف میں بڑی دقت نظر سے کام لیا گیا ہے۔ محاورہ کی برجستگی، الفاظ کی بندش، مصرعوں کی روانی۔ مختصر یہ انداز بیان کی دلکشی کا جہاں تک تعلق ہے مثنوی شروع سے آخر تک ہموار ہے۔ بہت کم ایسے الفاظ ملیں گے جو پورے ذوق کے ساتھ نہ منتخب کئے گئے ہوں یا جو کانوں کو گراں معلوم ہوتے ہوں یا جن کی ترتیب سست ہو۔ ملک برہج کے دولارے بیٹے دل کے قصہ میں لکھتے ہیں :-

"خدا کے فضل و کرم سے وہ جب جوان ہوا
تو گل کھلانے کو تیار آسمان ہوا"

دل سیر و شکار کے بہانے بہت دور نکل گیا اور ایک بالکل اجنبی ملک میں پہنچا۔ یہ نیرنگ شاہ کی قلمرو تھی۔ نیرنگ شاہ کے

نگارخانہ کی پُرفضا آب وہوا کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے:-

"وہ دیکھتا تھا جہاں تک نمو کا عالم تھا
عجب ہوا تھی عجب رنگ و بو کا عالم تھا"

"نظر کے سامنے سبزے بھی لہلہاتے تھے
ہرے ہرے نئے پودے نکلتے آتے تھے"

"نسیم صبح وہاں ہر طرف مچلتی تھی
صبا بھی جھوم کے اٹکھیلیوں سے چلتی تھی"

بیان میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو ایسے موقع اور ایسے
ت کے تصور سے خود بخود بلا خفیف سے خفیف محنت کے
ا پہ بے تکلف نہ آجائے اور جس کے لئے شاعر کو زحمت تلاش
ب گوارا کرنا پڑے - یہی ہے حسن فطرت کی سادگی اور
ہے اسکی رنگینی -

استعارہ اور تشبیہ میں بھی حضرت عبرت کی ندرتیں بسا
اوقات بڑی جمیل اور بڑی پرکیف ہوتی ہیں۔ وہ اکثر نئے
استعارات و تشبیہات سے کام لیتے ہیں جو نہ غیر مانوس ہوتے
ہیں نہ پیچیدہ۔ نگارستہ کے بادشاہ نیرنگ شاہ کی بیٹی شاہزادی
حسن کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

"وہ مس کہ جان گنوا بیٹھے تتیے جس پر"
"وہ چیز ناز ہیں کرتے بڑے بڑے جس پر"
"وہ چاندنی کہ جہاں ماہ ایک پارا ہے"
"وہ دھوپ جس کا کہ خورشید اک شرارہ ہے"
"وہ صبح جس میں نسیم مراد چلتی ہے"
"وہ شام آرزو کی شمع جس میں جلتی ہے"

اسکے بعد بڑی لطافت و نزاکت سے شاہزادی کا نام بتاتے ہیں۔

"وہ حسن یعنی بڑے عز و جاہ کی بیٹی
نگارخانہ کے نیرنگ شاہ کی بیٹی"

دل کی نا آزمودہ کاری بیان کرتے ہیں:-

"ادھر ادھر کی ہوائیں نہ تھا وہ کھائے ہوئے
نہ سرد و گرم زمانہ کا آزمائے ہوئے"

روزمرہ اور عام فہم زبان لکھنا اور اسکو عامیانہ اور مبتذل نہ ہونے دینا بہت بڑی فنی کامیابی ہے۔ حضرت عبرت نے اپنی یہ شان برابر قائم رکھی ہے۔ انکی زبان صاف اور ستھری ہے۔ لفظی اغلاق اور بہت بڑی حد تک معنوی پیچیدگیوں سے انکا کلام پاک ہوتا ہے۔ اسلوب عام فہم اور عام پسند ہوتا ہے لیکن کہیں سے عمومیت (بمعنی عامیانہ پن) نہیں آنے پائی اور خواص کیلئے بھی انکے کلام میں اتنی ہی دلکشی ہے جتنی کہ عوام

کے لئے ۔ انکے اسلوب کو بجا "قدرتی" کہنا زیادہ صحیح ہوگا
وہ فطرتِ انسانی اور واقعات و حوادث کا مطالعہ کرتے
ہیں اور اپنے نتائج کو سیدھی سادی زبان میں بے تکلفی
کے ساتھ بیان کرتے ہیں تاکہ دوسرے بھی ان سے مستفیض
ہوسکیں۔ لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ ان کے وہاں اسلوبی
ندرتوں کی کمی ہے۔ تصنع اور اسلوبی جدت طرازی کی
چند مثالیں اوپر پیش کی جا چکی ہیں کچھ اور ملاحظہ ہوں۔
جب دوسرے دن صبح کو دل چمن کے نظارہ کو چاہتا
ہے تو لکھتے ہیں :-

"بدن میں دل کی تر و تازگی نے جوش کیا
اٹھا وہ خاک سے بستر کو بار دوش کیا"
وہ اکڑتا جانب میدان کارزار چلا

"اُڑتا تھا خاک وہ جاندادہ بہار چلا"

"اُڑی جو خاک ہر اک سو نگارخانہ میں
تو زلفِ حُسن لگی پیچ کھانے شانہ میں"

حضرت عبرتؔ اکثر محض الفاظ کی تکرار یا انکے اُلٹ پھیر سے معمولی باتوں میں بھی ایک لطف خاص اور ایک اثر پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً جب قتِ حسن کی طرف سے ادا کا ایک تیر چلا ہے اور اس سے گھائل ہو کر دل وہیں بیٹھ گیا ہے تو اسکی حالت یوں بیان کرتے ہیں :-

"ٹھہر ٹھہر کے کلیجے میں درد ہوتا تھا
تڑپ تڑپ کے زمیں پر وہ جان کھوتا تھا"

اب آخر میں جابجا سے مثنوی کے چند اور اشعار انتخاب کر کے درج کئے جاتے ہیں تا کہ حضرت عبرتؔ کے شاعرانہ کمالات

کا صحیح اندازہ ہو سکے اور ناظرین کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ ان کی زبان کیسی سلیس، کیسی بے ساختہ اور کیسی رواں ہوتی تھی۔ ملکہ روح افزا وزیر عقل کی تصنیف میں لکھ رہی ہے:-

"پہنچتی غیب سے ہر وقت ہے مدد تجھ کو
دکھائی دیتا ہے دنیا کا نیک و بد تجھ کو"

"حواس و ہوش نہ ٹھہریں جو تو نہ ٹھہرائے
حواس خمسہ کا چہرہ ابھی بگڑ جائے"

"وفا شعار، سبک روح، باتمیز ہے تو
عجائبات خدا میں عجیب چیز ہے تو"

وزیر عقل دل کی تلاش میں روانہ ہوتے ہیں۔ پہلے علی الصباح خدا کی حمد کرتا ہے اور دعا مانگتا ہے:-

"تو اے خدا کسی نا کس کا پالنے والا
سروں سے آئی بلاؤں کو ٹالنے والا"

"ترے ہی جلوے کے تارے سب آسمان میں ہیں
ترے ہی رنگ کی نیرنگیاں جہان میں ہیں"

اسی سلسلہ میں آدمی کے اشرف المخلوقات ہونے کا ذکر آگیا ہے :-

"شعور و عقل سے جس کا دماغ روشن ہے
تمام خلق میں جس کا چراغ روشن ہے"

ہے جس کے ہاتھ میں دنیا کا انتظام تمام
بشر نہ ہو تو ابھی ہو جہاں کا کام تمام"

بشر کا کوئی جہاں میں نہیں مقابل ہے
اگرچہ تنگیٔ سینہ سے ضیق میں دل ہے"

"بشر نہیں ہے تو سارا جہان سونا ہے
سو وہ بھی تیری ہی قدرت کا اک نمونا ہے"

اسکے بعد پھر خدا کی حمد ہے۔

"رواں ہیں تیری ہی لہریں جہان فانی پر
تو ہی ہے موج زن اس ایک ٹوٹی ندیا پانی پر"

اگر تو چاہے تو غارت ابھی جہاں کر دے
زمیں کو چاہے تو بالائے آسماں کر دے"

"ٹپک ٹپک کے ہر اک قطرہ بحر آب بنے
چمک چمک کے ہر اک ذرہ آفتاب بنے"

"جو تیری شان کریمی میں کچھ دلیل کرے
اسے ہزار طرح آسماں ذلیل کرے"

وغیرہ وغیرہ۔

حضرت عبرت کی شاعری محض شاعری نہیں ہوتی
غزلوں میں دیکھئے یا نظموں میں وہ ہمیشہ ایک غایت لئے
ہوتے ہیں اور بغیر پند و نصیحت کے وہ بہت کم ہم کو نظر
آتے ہیں۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ کہیں
سے یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ ہم کو کوئی درس دے
رہے ہیں۔ یہ ان کی صناعی ہے۔ ان کے کلام میں اس
خشکی اور بے کیفی کا نام بھی نہیں ہے جو عموماً درسی یا اخلاقی
شاعری کی امتیازی شان ہوتی ہے۔

"حسن فطرت" بہت عجلت اور تیز رفتاری کے ساتھ
لکھی گئی اور پھر اس پر نظر ثانی نہیں ہوئی۔ مثنوی میں جو روانی
جو سلاست اور جو بے ساختہ پن ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔
جو چیز ایک قدرتی اپج کے زیر اثر ایک دُھن کے ساتھ لکھی

جائے گی اس میں نمائش اور تکلف کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ لیکن جس وجہ سے مثنوی میں یہ بےساختگی او رسادگی آگئی ہے اسی وجہ سے اسمیں چند خامیاں بھی رہ گئی ہیں۔ بعض محاورے غلط بندھے ہیں۔ مثلاً جہاں شاہزادی حسن کی سپاہ اور دل میں نبرد آزمائی ہوئی ہے وہاں لکھتے ہیں :-

"اِدھر یہ فوج گراں اور اُدھر اکیلا دِل
یہ کارزار میں کچھ ایسے کھل کے کھیلا دِل"

وغیرہ وغیرہ -

اس موقع پر "کھل کے کھیلا" محل غور ہے۔ اول تو اصل محاورہ "کھل کھیلنا" ہے۔ دوسرے اس موقع پر اس سے غیر ضروری ابہام پیدا ہو جاتا ہے -
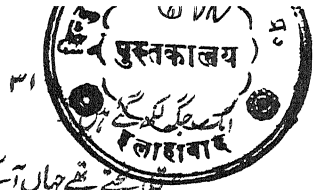
قلانچتے تھے جہاں آکے جھنڈ آہو کے"

محاورہ "قلانچیں مارنا" ہے۔

بعض مقامات پر "اور" کی "ر" گر جاتی ہے۔

جو لوگ پرانی لکیر کے فقیر ہیں اور ہر بات پر سند طلب کرتے ہیں اُن کے نزدیک یہ بہت بڑا عیب ہے لیکن حقیقتاً یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ جب ہم بولنے میں "اور" کی "ر" کی پروا نہیں کرتے تو کوئی وجہ نہیں کہ اگر کوئی نظم میں لکھتے وقت "اور" کی "ر" گرا دے تو اسے ضرورت سے زیادہ معیوب کیا جائے اور پھر جب بعض اساتذہ نے "ع" کا گر جانا جائز قرار دے دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسے موقعوں پر "ر" کا گر جانا جائز نہ سمجھا جائے۔

بہرحال اس قسم کی خامیاں "حسن فطرت" میں صرف خال خال ہیں۔ اور جو ہیں اُن کو صرف یہ سمجھ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ مصنف نے اسکو رو میں لکھا اور عجلت کے ساتھ لکھا اور پھر کبھی اس کو دُہرایا نہیں۔

مجنوں گورکھپوری

سکریٹری ایوان اشاعت
گورکھپور

حسنِ فطرت

مثنوی

تمہید

بگڑنا بنّا حقیقت میں اتّفاق پہ ہے
خوشی بشر کی مگر منحصر مذاق پہ ہے
صلاحِ خلق طبیعت کے برخلاف نہیں
مزاجِ اصل سے نیچر کو اختلاف نہیں
وہ نفس جس سے ہے قائم وجود انسانی
وہ کیفیت جسے کہتے ہیں لوگ نفسانی

اُترنا ذہن میں وہ مختلف خیالوں کا
وہ سونا خوابِ تصوّر میں ہوش والوں کا
بشر کی عمر طبیعی کا اک سہارا ہے
اگر نہ سمجھو تمہیں ذیل میں اشارا ہے

(ا)

تھا ایک شہر جو تھا چار عنصروں سے بنا
وہ چار کون۔ یہی آگ پانی خاک ہوا
انہیں پہ پائے تھا ہر کام انصرام اس کا
تمام خلق میں مشہور جسم نام اس کا
اور روح (نور خدا) تاج و تخت والی تھی
اسی کے دم سے فقط شہر کی بحالی تھی

فنا کی گود میں ہر چند وہ مچلتی تھی
ہمیشگی کا مگر راستا وہ چلتی تھی
تھا ایک لختِ جگر جس پہ تھا غرور اسے
اسی کے بادۂ الفت کا تھا سرور اسے
دل اس کا نام تھا سینہ میں تھا مقام اسکا
سواد جسم میں جو تھا وہ تھا غلام اس کا
خدا کے فضل و کرم سے وہ جب جوان ہوا
تو گل کھلانے کو تیار آسمان ہوا

(۳)

نکل گیا تھا وہ اک سمت سیر کرنے کو
دیارِ غیر میں ناداں گیا تھا مرنے کو

اسے خبر نہ تھی کچھ کس کی سرزمین ہے یہ
یہ ہند ہے کہ عدن ۔ قاف ہے کہ چین ہے یہ
وہ دیکھتا تھا جہاں تک نمو کا عالم تھا
عجب ہوا تھی عجب رنگ و بو کا عالم تھا
نظر کے سامنے سبزے بھی لہلہاتے تھے
ہرے ہرے نئے پودے نکلتے آتے تھے
نسیم صبح وہاں ہر طرف مچلتی تھی
صبا بھی جھوم کے اٹکھیلیوں سے چلتی تھی
سماں عجیب وہاں کے تھا سبزہ زاروں میں
کہ فصلِ گُل بھی کھڑی تھی امید واروں میں

۵

ہر ایک گوشۂ گلزار میں بہار تھی واں
چہار سمت سے ہردم یہی پکار تھی واں
بہشت اگر ہے کہیں تو اسی زمین پر ہے
یہیں کی خاک ہے جو چاند کی جبیں پر ہے
دکھائی دیتا تھا قدرت کا کارخانہ اُسے
وہاں کے لوگ تھے کہتے نگارخانہ اُسے
ہر اک روش پہ وہ مستانہ وار جھومتا تھا
ہر ایک کوچہ میں حیرت زدہ سا گھومتا تھا
قدم قدم پہ مسرت سے تھا نہال بہت
وہ دل میں کرتا تھا حسرت سے قیل وقال بہت

کہ ناگہاں اُسے کچھ دُور سے نظر آیا
ہو جیسے نور کا دامن کسی نے پھیلا یا

(۳)

وہ تاب جس سے بہت پیچ و تاب ہوتا ہے
وہ بادہ جس سے بہت دل کباب ہوتا ہے
وہ من کہ جان گنواں بیٹھے منچلے جس پر
وہ چیز ناز ہیں کرتے بڑے بھلے جس پر
وہ چاندنی کہ جہاں ماہ ایک پارا ہے
وہ دھوپ جس کا یہ خورشید اک شرارا ہے
وہ صبح جس میں نسیم مراد چلتی ہے
وہ شام آرزو کی شمع جس میں جلتی ہے

وہ یعنی حُسن بڑے عز و جاہ کی بیٹی
نگار خانہ کے نیرنگ شاہ کی بیٹی
بڑے جلال و بڑے کر و فر سے آتی تھی
ہر ایک شئے کو گراتی نظر سے آتی تھی
وہ آ کے جب ہوئی داخل نگار خانے میں
تو جگمگا اُٹھی وہ سرزمیں زمانے میں
وہ چونکہ صبح ازل سے تھی پاکباز بہت
نگاہ غیر سے رکھتی تھی احتراز بہت
وہ اجنبی کی نگاہوں سے شرم کھاتی تھی
حیا کی اوٹ میں مُنہ اپنا وہ چھپاتی تھی

پڑی نگاہ دلِ بوالہوس پہ جب ناگاہ
تو تمتما اُٹھی - جوشِ غضب سے غیرتِ ماہ
ادا و ناز سے (جو تھیں سہیلیاں اسکی
جو بوجھا کرتی تھیں ہردم پہیلیاں اسکی)
کہا کہ دیکھو مقابل میں یہ کھڑا ہے کون
ہمارے سامنے ضد کی طرح اڑا ہے کون
ہے سر کا درد مرے جسم کا بخار ہے یہ
ہٹاؤ جلد بہت مجھکو ناگوار ہے یہ
گئیں یہ سب تو وہ مردانگی دکھانے لگا
حواس باختہ دیوانگی دکھانے لگا

ہٹا نہ سامنے سے ان کے وہ اَڑا ہی رہا
مثالِ سایۂ دیوار وہ کھڑا ہی رہا
یہ حال دیکھ کے واپس گئیں وہ حسن کے پاس
کہا نہیں کوئی تدبیر اپنی آئی راس
کرشمہ۔ عشوہ کو بھی حکم ہو کہ آؤ تم
کہا یہ حسن نے جلدی انھیں بُلاؤ تم
یہ کہہ کے حسن ہٹی واں سے بدگماں ہوکر
نظر سے ہوگئی اوجھل شرر فشاں ہوکر

(۴)

ہٹی جو حسن تو دل کو بھی کچھ قرار آیا
شجر کے نیچے وہاں سے وہ ہونہار آیا

وہ سبزہ زار پہ بستر جما کے بیٹھ گیا
نگار خانہ میں ہل چل اُٹھا کے بیٹھ گیا
معاملات میں وہ آزمودہ کار نہ تھا
خود اپنی ذات پہ کچھ اس کو اعتبار نہ تھا
اِدھر اُدھر کی ہوائیں نہ تھا وہ کھائے ہوئے
نہ سرد و گرم زمانے کا آزمائے ہوئے
ہزار طرح کا جی میں خیال ہوتا تھا
امید و بیم سے غیر اس کا حال ہوتا تھا
حواس و ہوش کا سر میں نہ تھا پتا پاتا
ہوا کے ساتھ تھا اندیشہ راستا پاتا

غرض کہ رات کٹی اضطراب میں اُس کی
اُچاٹ نیند ہوئی پیچ و تاب میں اس کی

(۵)

علی الصباح جو خورشید نے نکالا مُنہ
اور اُس کے ساتھ ہی شب نے چھپایا کالا مُنہ
بدن میں دل کے تر و تازگی نے جوش کیا
اُٹھا کے خاک سے بستر کو بار دوش کیا
وہ تھا جوان بڑا زعم تھا ابھی اس کو
بلند حوصلہ تھا۔ تھی نہ کچھ کمی اس کو
اکڑتا جانبِ میدانِ کارزار چلا
اُڑاتا خاک وہ جاں دادۂ بہار چلا

اُڑی جو خاک ہر اک سو نگار خانے میں
تو پیچ کھانے لگی زُلفِ حسن شانے میں
کہا یہ حسن نے کس کی یہ گُل فشانی ہے
ہوا ہے یا کوئی طوفان آسمانی ہے
بستر چڑھا ہے کوئی سر پہ منہ کی کھانے کو
بتاؤ ناز و ادا گر ہو تم بتانے کو
غضب جو حسن کی تیوری چڑھی ہوئی دیکھی
اور اس کی آنکھوں کی سُرخی بڑھی ہوئی دیکھی
ہو متّفق لبِ اظہار وا کیا سب نے
اور اس طرح سے بیاں حال کر دیا سب نے

حضور کل جو پئے سیر باغ جاتی تھیں
نگار خانے میں ٹھنڈی ہوائیں کھاتی تھیں
تو راستہ میں تھا اک نوجواں کھڑا آکر
پئے مقابلہ گویا وہ تھا اڑا آکر
سنا جو حسن نے اتنا تو اس کو دھیان آیا
کہا کہ ہاں تھا سرِ راہ اِک جوان آیا
اگر اُسی کی شرارت سے ہے اُڑائی خاک
تو خاک میں مَیں ملا دوں ابھی یہ تہ افلاک
بلاؤ عشوہ - کرشمہ کو جلد آئیں وہ
یہ وقت ہے کہ جوانمردیاں دکھائیں وہ

کہو یہ غمزہ سے اپنا بھی کھول دے پرچم
ہر ایک سمت سے آکر دکھائیں سب دم خم
غرض کہ حسن نے سامان سب درست کیا
سپاہ لے کے چلی سب کو چاق و چست کیا
بڑھا کے جلد قدم آئی کارزار میں وہ
مثال برق گری آکے سبزہ زار میں وہ
کرشمہ۔ عشوہ بھی آئے پرا جمائے ہوئے
بہت سے تیر و تفنگ اپنے ساتھ لائے ہوئے
بجھی تھیں زہر میں تلواریں جو چمکنے لگیں
اور اُن پہ یاس بھری آنکھیں دل کی تکنے لگیں

ہر ایک سمت سے نظارگی کا تیر چلا

بکھر گئے خوب ہی آوارگی کا تیر چلا

ادھر یہ فوج گراں اور اُدھر اکیلا دل

پہ کارزار میں کچھ ایسا کھل کے کھیلا دل

کہ چھکے چھوٹ گئے حسن کے جوانوں کے

وہ زرد پڑ گئے۔ لالے پڑے تھے جانوں کے

یہ حال دیکھ کے ذی ہوش حسن دنگ ہوئی

کھڑی تھی کھیت میں جو فوج وہ بھی تنگ ہوئی

ہٹی جو فوج تو پھر حسن بھی ٹھہر نہ سکی

اُڑی حواس کی صورت پری ٹھہر نہ سکی

یہ چلتے چلتے رواں تیر اک ادا کا ہوا
دل اس سے بچ نہ سکا اور ہدف بلا کا ہوا

لگا جو تیر تو دل نے جگر کو تھام لیا
زمیں پہ بیٹھ گیا بیکسی کا نام لیا

چُبھا وہ سینہ میں ایسا کہ پھر نکل نہ سکا
اُٹھا وہ درد کہ دل بھی وہاں سے ٹل نہ سکا

ٹھہر ٹھہر کے کلیجہ میں درد ہوتا تھا
تڑپ تڑپ کے زمیں پر وہ جان کھوتا تھا

کِھلا تھا پھول سا جو چہرہ پُر ملال ہوا
کلیجہ خون ہوا دل کا اور حال ہوا

(۶)

اِدھر لڑائی میں دل تو وہ تیر کھا کے گِرا
غرور سا سرِ میداں وہ سر اُٹھا کے گِرا
اُدھر جو حُسن گئی گھر پہ تو قرار نہ تھا
بہت اُداس تھی چہرے پہ وہ نکھار نہ تھا
دکھایا تھا اُسے کچھ دل نے بانکپن ایسا
لڑا تھا معرکہ میں وہ چلا کے من ایسا
کہ تابِ حُسن میں باقی نہ تھی لڑائی کی
تمام ڈھیلی پڑی تھیں رگیں کڑائی کی
اِس انتشار میں تھا نشۂ دماغ اُس کا
خزاں کو کھینچ رہا تھا شگفتہ باغ اُس کا

سہیلیوں نے جو دیکھا کہ بے قراری ہے

سمجھ گئیں کہ لگا کوئی زخم کاری ہے

حواس باختہ دوڑیں ۔ حضور میں آئیں

ادب کے ساتھ سخن یہ زبان پر لائیں

یہ کیا ہوا جو پراگندہ ہے مزاج ۔ حضور

دکھائی دیتی ہیں رنجیدہ ہمکو آج ۔ حضور

خدا نخواستہ پہونچا کوئی ملال ہے کیا

بتائیں ہمکو حضور آج جی کا حال ہے کیا

کہا یہ حسن نے پہونچا کوئی گزند نہیں

میں پُر ملال نہیں ہوں میں دردمند نہیں

اگر ہے کچھ تو مجھے دل سے بدگمانی ہے
ابھی جوان ہے اُٹھتی ہوئی جوانی ہے
لڑیگا خوب ہی میدانِ کارزار میں وہ
یہ خوف ہے نہ اُڑائے مجھے غبار میں وہ
کسی طرح سے مَیں ہو سکتی ہم نبرد نہیں
جوان ہوں - مگر اس کی طرح تو مرد نہیں
شکست و فتح بشر قسمتوں سے پاتا ہے
پہ عزّ و جاہ کو اپنی ہر ایک بچاتا ہے
مَیں چاہتی ہوں کہ کچھ اور ڈھب کی بات چلے
کہ خوب زِچ ہو یہ دل اور کھا کے مات چلے

(۷)

سہیلیوں نے سنی جب یہ دور کی باتیں
تو بولیں وہ کہ ہیں سب سچ حضور کی باتیں
یہی ہے شیوۂ عقل اور مقتضائے شعور
کہ آدمی کرے وہ کام جو بتائے شعور
پہ کیا کریں کہ ہمارا کچھ اختیار نہیں
ہم عورتوں میں کوئی ایسی ہوشیار نہیں
تفاؤل آئے تو شاید سدھارے کام کو وہ
کہ جانتا ہے لڑائی کے روک تھام کو وہ
ہر ایک فتنہ کو دم دے کے وہ سُلاتا ہے
وہ اپنے گُن پہ ہر اک شخص کو لگاتا ہے

اِسی لئے وہ مقرّر ہے اس کا کام سمجھ یہ
وہ آسکے ۔ مشورہ اُس سے ہو ۔ وقت شام ہے یہ
ادا و ناز کی القصّہ ختم بات ہوئی
صلاحِ شُورہ کا وقت آیا یعنی رات ہوئی

(۸)

شبِ سیہ نے جہاں میں اُتارا ڈیرا جب
زمیں سے لیکے فلک تک ہُوا اندھیرا جب
عدم مثال نگاہوں میں کائنات ہُوئی
حضورِ حُسن ۔ تغافل کی بڑھکے بات ہُوئی
کہا کہ حکم ہے کیا ۔ کیوں مجھے بُلایا ہے
کوئی عدو؟ کوئی مہمان گھر میں آیا ہے؟

مَیں بند کر دوں اُٹھا ہو اگر فساد کوئی
نظر کے سامنے رکھ دوں اگر ہو یاد کوئی
کہا یہ حسن نے تجھ پر ہے اعتبار مجھے
خزاں میں بھی تُو دکھا دیتا ہے بہار مجھے
کیا ہے یاد تجھے میں نے ایک کام سے آج
پڑی ہے کھلبلی قلب و جگر میں شام سے آج
ہے اک جوان کہ دل نام جس کا سُنتی ہوں
ہمیشہ بوالہوسی کام جس کا سُنتی ہوں
نگار خانے میں آ کر مرے سمایا ہے
اُڑا کے خاک مرے رنگ کو اُڑایا ہے

دکھایا خوب مجھے آج سبز باغ اس نے
بہت کیا ہے پریشاں مرا دماغ اس نے
میں چاہتی ہوں تغافل کوئی عمل تو چلا
پڑیں نہ پاؤں جہاں دل کو سر کے بل تو چلا
سنی جو حسن کی سب پیچ و تاب کی باتیں
بنا کے لایا تغافل جواب کی باتیں
کہا۔ حضور نہ دیں راہ انتشار کو کچھ
نہ ڈالیں آپ تردد میں کاروبار کو کچھ
ہمارے ہوتے کوئی بیقرار ہوتا ہے
ہمارے پاس سے دور انتشار ہوتا ہے

کہاں ہے وہ ابھی لیتا ہوں دیکھ بھال اُسے
ابھی ابھی کئے دیتا ہوں پائمال اُسے

(۹)

اِدھر تو دستِ تغافل میں اختیار ہُوا
اُدھر سُنو کہ بہت دل کا حال زار ہُوا
تمام رات نہ آیا ذرا بھی خواب اُسے
لگی نہ آنکھ کچھ ایسا تھا پیچ و تاب اُسے
وہ زخمِ تیرِ ادا کے اثر سے روتا تھا
بہت جدائیِ قلب و جگر سے روتا تھا
رہا گیا نہ جب اس سے تو درد سے بولا
پکار کر یہ غمِ ہم نبرد سے بولا

کہ اے نعیم نہ روانی پسند کی تو نے

دیارِ غیر میں جو راہ بند کی تو نے

نگار خانہ میں ابتک نہ تھا اُبھر کے چلا

ہمارے پاؤں میں زنجیر کیوں تو بھر کے چلا

تو اے نعیم غمِ دلفگار غارت ہو

تری بلا ترا بوس و کنار غارت ہو

قدم قدم پہ ہوں پامال بخت سوتا ہے

گھڑی گھڑی پہ مرا وقت مجھکو روتا ہے

خزاں جھپٹتی ہے یارب بہار پر میری

کسی کو بھیج مدد کو۔ پکار پر میری

یہ کہہ کے وقتِ سحر کارزار سے اُٹھا
مثال شیر تڑپ کر کچھار سے اُٹھا
اُٹھا سمجھ - پہ یہ دہشت تھی ہار کی اُس کو
چکارتی تھی زمیں کارزار کی اُس کو

(۱۰)

ادا کے ہاتھ سے وہ تھا جو کھا کے داغ چلا
چلا اُدھر کو جدھر حسن کا سراغ چلا
لگی تھی جی سے کہ پھر حسن کے مقابل ہو
جگر کا داغ درخشندگی کے قابل ہو
مگر یہاں تو تغافل کا ہو گیا تھا عمل
ہر اِک طرف تھی خموشی - کہیں نہ تھی ہل چل

بنایا واں تھا تغافل نے ایک حصار ایسا
نظر جو دُور سے آتا تھا کوہسار ایسا
کیا تھا دل کو مقیّد وہاں تغافل نے
ملا دیا تھا زمین آسماں تغافل نے
وہاں سے دل نہ نکلنے کی راہ پاتا تھا
تڑپ تڑپ کے وہیں زندگی گنواتا تھا
سر و دماغ میں سَودا سما گیا اس کے
حواس و ہوش میں بھی فرق آگیا اِسکے
کیا نصیب نے اس کے بہت زبوں اس کو
خلل دماغ میں آیا - ہُوا جنوں اس کو

(۱۱)

عزیز دل کی کہیں سے خبر نہ آئی جب
کسی نے گمشدگی کی خبر سنائی جب
تو روح دردِ جدائی سے بیقرار ہوئی
اثر سے اُلفتِ فطری کے اشکبار ہوئی
نہ پہونچی کانوں میں جب بندوبست کی آواز
تمام شہر میں گونجی شکست کی آواز
یہ بیقرار تھی لختِ جگر کے کھونے سے
پڑی تھی شہر میں اک کھلبلی سی رونے سے
پئے تسلیِ خاطر نہ کچھ دوا نکلی
جگر میں درد سمایا تو یہ صدا نکلی

مجھے نہیں قلقِ بختِ آزمائی ہے
پہ یہ ستم ہے کہ فرزند کی جدائی ہے
جو میری گود میں پھیلا کے پاؤں سوتا تھا
جو میری آنکھ سے اِک دم جُدا نہ ہوتا تھا
سمجھتی گوشۂ دل کا جسے قرار تھی میں
مراد جس کو سمجھ کر امیدوار تھی میں
تجھ کے ساتھ تعلق نے جس کے راہ تھی کی
لگا کے کلیجے سے جس کی چاہ تھی کی
وہی نگاہ سے میری نہاں تھا ہونے کو
غلط خبر وہی پیوند جاں تھا ہونے کو

ابھی نکلنے کے قابل تو اس کا دن بھی نہ تھا
فسانہ طول کھنچا - وہ دراز سن بھی نہ تھا

کہاں گیا نہیں ملتا ہے کچھ سُراغ اس کا
زمیں پہ ہے کہ فلک پر چڑھا دماغ اس کا

کھنچا وہ کس سے کدھر جذبِ آب و دانہ ہوا
بھلایا کس نے اسے - کس کا وہ بہانہ ہوا

مکان و باغ نہیں مجھکو آج بھاتا ہے
نکل گئی ہے خوشی اور غم ستاتا ہے

جہاں امید مچلتی تھی واں پہ یاس ہے اب
اُگا تھا سبزہ جہاں واں پہ سوکھی گھاس ہے اب

پپتا عزیز کا لادو کوئی خدا کے لئے
ہماری چیز دلادو کوئی خدا کے لئے
شکستہ دِل مرا یارب قرار پا جائے
ہوا کے ساتھ پلٹ کر بہار آ جائے

(۱۴)

بہت جو روح کا شور و فغاں بلند ہوا
تو سلطنت کا ہر اک کار و بار بند ہوا
عجب مچی ہوئی ہل چل تھی قصر شاہی میں
کہ جان و مال تھے سب آ گئے تباہی میں
تمام شہر کے چھوٹوں بڑوں میں رونا تھا
تمام اونچے گھروں جھونپڑوں میں رونا تھا

دل و جگر نہ تھے قابو میں بیقرار تھے سب
ہو کیوں نہ غم کہ بہی خواہ شہریار تھے سب
وہ کون تھا نہیں جس کو غمِ حضوری تھا
ہر ایک یاس میں منّت کشِ صبوری تھا
کسی کو خوش نہیں آتی تھی واں کی چیز کوئی
کہ تھا نگاہوں سے اُن کی چھپا عزیز کوئی
کسی کی کچھ نہیں چلتی تھی بے حواس تھے سب
تھی بات بات میں حسرت۔ بہت اُداس تھے سب
ہَوا ہوئے تھے حواس ایسے ہوشیاروں کے
خزاں میں رنگ اُڑیں جیسے سبزہ زاروں کے

پڑی تھیں خیق میں یوں جانیں غمگساروں کی
ہو جیسے اُٹھتے دھوئیں میں لپیٹ شراروں کی

خلل پڑا ہوا ہر ایک انتظام میں تھا
کہ بختِ بد کا اثر اُن کی صبح و شام میں تھا

صدا خرابی کی آتی تھی بند و بستوں سے
غم و الم کی تھی آمد خوشی کے رستوں سے

بھرے اگرچہ سبھوں نے دم آشنائی کے
مگر گِلے تھے نصیبوں کی نا رسائی کے

اُڑا تھا گردشِ گردوں سے ان کا رنگ بہت
فلک کی چال سے آئے ہوئے تھے تنگ بہت

پئے تلاش گئے گو سپاہ مرد بہت
پہ سخت راہوں سے پھر آئے ہو کے گرد بہت
جو غم نے تلخ کیا ان کے آب و دانے کو
حواس و ہوش گئے عقل کے بلانے کو

(۱۳)

وہ عقل کون جو سچا مشیر روح کا تھا
نمک حلال مدبر وزیر روح کا تھا
جو دیکھا کار گزاروں کو منتشر ہیں تمام
حواس باختہ بکھرے اِدھر اُدھر ہیں تمام
قلق ہوا اُسے بربادی و تباہی کا
کہ منتظم تھا وہی بارگاہ شاہی کا

یہ دیکھتا وہ محل کی طرف شتاب آیا

حریمِ روح میں با دیدۂ پُر آب آیا

یہاں جو دیکھا تو ملکہ تھی دردمند بہت

چڑھا تھا تار بلندی پہ تھی کمند بہت

ملول روح کو جو اس نے اس طرح پایا

تو بات یہ پئے تسکیں زباں پہ لایا

کہ واقعی ستمِ جاں گداز ٹوٹا ہے

خوشی کے نغمۂ دلکش کا ساز ٹوٹا ہے

زمین و چرخ نے کچھ ایسے ہی پسند کیا

چھپا کے دل کو جو ہر اک کو دردمند کیا

ہیں ماہ و سال کے چکّر جو دمبدم ہوتے

تو ہیں ہزاروں نشاط اور غم بہم ہوتے

کبھی وہ دن تھے کہ ہر روز عید دیکھتے تھے

سروں پہ سایۂ بختِ سعید دیکھتے تھے

خوشی خوشی سے بدلتے تھے صبح شام کے ساتھ

بہت تھا بستر آرام تھوڑے کام کے ساتھ

جھلک تھی ماہ نمط بخت کے ستاروں میں

تھے چلتے کام بہت زور کے سہاروں میں

کبھی بلا نہیں ٹوٹی تھی بندو بستوں پر

کبھی نہ داغ لگا تھا وفا پرستوں پر

چہار سمت سے ہردم خوشی برستی تھی
زمینِ خُلد بریں میں یہاں کی بستی تھی
اور اب ہے رنج و مصیبت کا سامنا سبکو
کٹھن ہوا ہے بہت دل کا تھامنا سبکو
بُرے دنوں میں مقدّر خراب ہوتا ہے
ہر ایک کام میں ناکامیاب ہوتا ہے
کسے نہیں ہے قلق وقت کی بُرائی کا
گھڑی گھڑی پہ تو کھٹکا ہے بے وفائی کا
نرالی طرز ہے قدرت کے کارخانے کی
نہیں ہے ایک چلن پر روِش زمانے کی

بشر کو چاہئے وہ صبر اور شکیب کرے
امید کا نہ مصیبت میں خالی جیب کرے
خدا وہ ہے جسے سب کارساز کہتے ہیں
غریب پرور و بندہ نواز کہتے ہیں
حضور در سے کبھی اس کے نا اُمید نہ ہوں
بہت نہ روئیے آنکھیں کبھی سپید نہ ہوں
نہیں ہے فائدہ اس وقت رنج کرنے سے
زیادہ ہوگی جلن ٹھنڈی آہ بھرنے سے ۔
پئے سُراغ میں نکلوں گا صبح دم گھر سے
تلاشِ دل میں اُٹھے گا ہرا قدم گھر سے

خدا نے چاہا تو اس کا پتا لگاؤں گا
جہاں پہ ہوگا مرا دل وہیں میں جاؤں گا

(۱۴)

دکھایا عقل نے غرّہ جو زور بازو کا
تو سنگ موم ہوا رنج کے ترازو کا
سنبھل سنبھل کے ہر اک شخص کو قرار ہوا
ٹھہر ٹھہر کے شکست آنسوؤں کا تار ہوا
اٹھایا روح نے بھی ہاتھ آہ و زاری سے
جگر کو تھام کے کی بات بردباری سے
مرے وزیر ترے دم سے شادمانی ہے
مری زمیں پہ تو اک نور آسمانی ہے

پہونچتی غیب سے ہر وقت ہے مدد تجھکو
دکھائی دیتا ہے دُنیا کا نیک و بد تجھکو

تجھی سے آدمی چلتا ہے نیک راہوں پر
جو تُو رہے نہ تو پردہ پڑے نگاہوں پر

ہے رہبری تری مشکل گزار رستوں میں
تجھی سے جان پڑی ہے وفا پرستوں میں

ترے ہی دم سے ہُوا صلح کل کی چلتی ہے
تجھی سے شمع محبت دلوں میں جلتی ہے

ترے ہی حسن عمل سے ہے اتفاق یہاں
بگڑ کے دیکھ لے پڑتا ہے کیا نفاق یہاں

حواس و ہوش نہ ٹھہریں جو تو نہ ٹھہرائے
حواسِ خمسہ کا چہرہ ابھی اُتر جائے
گھروں میں آئیں نظر آدمی بہائم سے
سیاہ نامۂ اعمال ہو جرائم سے
وفا شعار۔ سبک روح۔ باتمیز ہے تو
عجائباتِ خدا سے عجیب چیز ہے تو
عجیب چیز ہے تو بخششِ الٰہی سے
خدا دے عقل تو بڑھکر ہے بادشاہی سے
عَلم بلند تو رکھتا ہے خیر خواہی کا
وفا پرست تو نوکر ہے بادشاہی کا

درِ بلند سے رتبہ بلند پاتا ہے

تمام شہر کا افسر تجھے بنایا ہے

سنبھالی تو نے حکومت ہے ہوشیاری سے

ہُوا ہے تخت کا سرتاج حق گذاری سے

جو تُو نہ ہو تو تباہی میں کچھ کلام نہیں

تُو خیر خواہ حقیقی ہے کچھ غلام نہیں

مری نگاہوں میں تاریک سب خدائی ہے

جگر کی چوٹ ہے۔ فرزند کی جُدائی ہے

جگر ہے چاک کلیجہ ہے پاش پاش مرا

کیا ہے دلؔ کی جُدائی نے راز فاش مرا

بجا نہ ہوش ٹھکانے نہ ہے تمیز مری
نظر کے سامنے سے کھو گئی ہے چیز مری
گیا وہ جب سے مجھے ایک دم قرار نہیں
اُجاڑ گھر ہے چمن میں مرے بہار نہیں
مرے عزیز کی آرام گاہ سُونی ہے
زیادہ اس سے کوئی بخت کی زبونی ہے
میں کیا کہوں کہ مِرے دل پہ کیا گذرتی ہے
مری امید کی کھیتی کو یاس چرتی ہے
قلق نہیں مجھے اس کا نشاں نہ پانے کا
دیارِ غیر میں ڈر ہے ستائے جانے کا

کڑی مصیبتیں جھیلے گا سخت راہوں میں
سما نہ جائے کہیں وہ بری نگاہوں میں
مصیبتوں کا ہے اڑتا غبار غربت میں
نہیں ہے گھر کی طرح سے بہار غربت میں
گلی گلی میں خطر رہزنوں سے جان کا ہے
چمن چمن ہے بیاباں کہ زیر خزاں کا ہے
وہ لوگ ہیں جو بہت کچھ زمانہ دیکھے ہوئے
طرح طرح کشش آب و دانہ دیکھے ہوئے
سفر کے نام سے کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں
کشاکش سحر و شام سے بکھرتے ہیں

ہزار حیف مرا دل نے ساتھ چھوڑا ہے
نکل کے دور محبت کا تار توڑا ہے
مجھے تو اب کسی صورت یہاں قرار نہیں
میں کیا کروں مرا جاندادہ یہ سار نہیں
پتا تو دل کا لگا کے قرار دے مجھکو
نسیم وقت - نوید بہار دے مجھکو

(۱۵)

یہ کہہ کے روح جو چپ ہو گئی تو عقل اٹھا
محل سے روح کے اپنے مکان پر آیا
نشست گاہ میں اپنی وہ آکے بیٹھ گیا
ہر اک کو پاس سے اپنے اڑا کے بیٹھ گیا

ہزار فکر سے بیٹھا نشست گاہ میں تھا
کہ صبح دم اُسے چلنا سفر کی راہ میں تھا
گئی جو رات زیادہ وہ آکے لیٹ رہا
محل میں بسترِ راحت پہ جاکے لیٹ رہا
رہا وہ خواب میں لیکن نہ اس کو نیند آئی
ہزار شکل سے وحشت بھری اُمید آئی
تفکرات سے پچھلے پہر وہ گھبرایا
سحر سے پیشتر اندیشۂ سفر آیا
علی الصباح اُٹھا خواب گاہ سے اپنی
خدا کا نام لیا نکلی چاہ سے اپنی

جو نشے جذب ہوئے سر میں حق گزاری کے
تو اُس کے مُنہ سے جھڑے پھول حمد باری کے

(۱۶)

تو اے خدا کس و ناکس کا پالنے والا
سروں سے آئی بلاؤں کا ٹالنے والا
کھلا نہ حال ترا وہ بڑا سبب ہے تو
گھٹا نہ وقت ترا ایسا روز و شب ہے تو
اگرچہ وہم و گماں نے کیا خیال بہت
ترے لئے ہوئی ہر چند قیل و قال بہت
کوئی بھی تیری حقیقت بیان کر نہ سکا
نہ کر سکا شرحِ داستان کر نہ سکا

مگر جنھوں نے ترا فیض کچھ اُٹھایا ہے
وہ جانتے ہیں کہ تو نے ہی سب بنایا ہے
تری ہی ذات سے ہے سب کا سب جہاں قائم
تجھی سے ہیں یہ زمین اور آسماں قائم
چمک سے تیری ہی سارا جہاں اُجالا ہے
ڈپٹ سے تیری ہی دنیا میں بول بالا ہے
ترے ہی جلوے کے سب تارے آسماں میں ہیں
ترے ہی رنگ کی نیرنگیاں جہان میں ہیں
ہوا کے دوش پہ اُڑتے پرند جتنے ہیں
زمیں کی گود میں مردم۔ چرند جتنے ہیں

پڑے ہیں امن و اماں سے تری پناہ میں سب

اُچھلتے کُودتے جاتے ہیں تیری راہ میں سب

یہ آسماں کہ خورشید و ماہ ہیں جس پر

یہ سرزمین گدا اور شاہ ہیں جس پر

یہ آفتاب کہ دن میں ہے روشنی جس کی

یہ ماہ رات کو چھٹکتی ہے چاندنی جس کی

یہ آدمی جو بنا ایک مُشت خاک سے ہے

مدام کھلبلی جس کو امید و باک سے ہے

جو پھاڑتا ہے گریباں کو نا اُمیدی سے

نہیں سماتا جو جامے میں خوش نویدی سے

نہیں سمجھتا عبارت جو سر نوشتوں کی
اگرچہ آنکھ جھپک جاتی ہے فرشتوں کی
شعور و عقل سے جس کا دماغ روشن ہے
تمام خلق میں جس کا چراغ روشن ہے
ہے جس کے ہاتھ میں دنیا کا انتظام تمام
بشر نہ ہو تو ابھی ہو جہاں کا کام تمام
چراغ گُل ابھی ہو جائے ساری بستی کا
رہے نہ غلغلہ باقی خدا پرستی کا۔
بشر کا کوئی جہاں میں نہیں مقابل ہے
اگرچہ تنگیِ سینہ سے ضیق میں دل ہے

نصیب و بخت نہ اس کا اگر کمی کرتا

تو پھر جہان میں کیا کچھ نہ آدمی کرتا

ہر ایک طرح کا جذبہ ہے اس کے سینے میں

یہ موج مارتا ہے عمر کے سفینے میں

اٹھائے بوجھ ہے سر پر تمام ہستی کا

بلند غلغلہ ہے آشنا پرستی کا

ہے اک کو ایک سے مطلب جہان فانی میں

اسی سے لطف ہے دو دن کی زندگانی میں

یہ مختصر سا کرشمہ ہے ساری دنیا کا

عجیب چیز ہے پیارا ہے پیاری دنیا کا

بشر نہیں ہے تو سارا جہان سُونا ہے
سو وہ بھی تیری ہی قدرت کا اک نمونا ہے
بجز بشر کے بھی جو ہے جہان میں پیدا
زمیں ۔ زمانہ میں ۔ اور آسمان میں پیدا
ہر ایک چیز تجھی سے ہوئی وجود پذیر
تری ہی ذات سے سب کچھ ہے اے خدائے قدیر
رواں ہیں تیری ہی لہریں جہان فانی میں
تُو ہی ہے موج زن اس ایک بوند پانی میں
ہر ایک شئے سے ہے اظہار تیری قدرت کا
ہے آفتاب نمودار تیری قدرت کا

فقط نہ بخت ہے خورشید و ماہ کا روشن
ہے ذرّہ ذرّہ تری جلوہ گاہ کا روشن

ہے تیرے نور پہ خود روشنی گواہ تری
وہ چشم کور ہے پاتی نہیں جو راہ تری

مری تو آنکھ کھلی ہے تری حقیقت سے
نہیں نہیں مجھے انکار تیری قدرت سے

اگر تو چاہے تو غارت ابھی جہاں کر دے
زمیں کو چاہے تو بالائے آسماں کر دے

ٹپک ٹپک کے ہر اک قطرہ بحرِ آب بنے
چمک چمک کے ہر ایک ذرّہ آفتاب بنے

غضب کی دھول چڑھے اور کچھ پتا نہ ملے

کہیں زمین و زمانے میں راستا نہ ملے

اُڑے وہ خاک کہ نقش و نگار کھو جائیں

زمیں کے حال پہ سات آسمان رو جائیں

غرض عیاں و نہاں سب تری صفات میں ہیں

غضب و لطف خداوند تیری ذات میں ہیں

تمام خلق کی رونق بہار تو ہی ہے

جو کچھ بھی ہے مرے پروردگار تو ہی ہے

ترے ہی دم کا بھروسا ہے جانداروں کو

سنبھالتا ہے ترا لطف بیقراروں کو

امید گاہ ہے تو ہی تمام جانوں کی
تو ہی زمین ہے ان سات آسمانوں کی
ہر اک کو ناز ہے بندہ نوازیوں پہ تری
گواہ خلق ہے سب کارسازیوں پہ تری
مصیبتوں میں دلوں کو ٹٹولتا ہے تو
گرہ کو ناخنِ حکمت سے کھولتا ہے تو
جب آکے آفتیں اپنا اثر دکھاتی ہیں
بُری بلاؤں کی کالی گھٹائیں چھاتی ہیں
ہوائیں چلتی ہیں ہر سمت سے خرابی کی
جگر پہ بیٹھتی ہے گرد اضطرابی کی

۸

ہوائے غم سے پریشاں دماغ ہوتا ہے
نہیں ہے سوجھتا کچھ ۔ گُل چراغ ہوتا ہے
نظر کے سامنے چھا جاتا ہے اندھیرا سا
مکانِ عیش ہے بن جاتا ایک گھیرا سا
تڑپ تڑپ کے جُدا بند بند ہوتا ہے
جگر کی چوٹ سے دل درد مند ہوتا ہے
پکارتے ہیں مدد کے لئے ہزاروں کو
مگر کوئی بھی تو سُنتا نہیں پُکاروں کو
عزیز و خویش ہر اک اپنا مُنہ چھپاتا ہے
یہ سچ ہے کون مصیبت میں کام آتا ہے

ہجومِ یاس سے کھاتے ہیں پیچ و تاب بہت

بشر کو کرتی ہے بیچارگی خراب بہت

تو کھول دیتا ہے پرچم تو مہربانی کا

چراغ گل نہیں ہوتا ہے زندگانی کا

ہے کیا عجب تری بخشش سے شادکام ہوں مَیں

کہ بارگاہِ کریمی کا اک غلام ہوں مَیں

رگوں میں خون بھرا ہے تری محبت کا

کہ ہے تو پالنے والا تمام خلقت کا

سلامتی ہے ہمیشہ تری سلامی میں

کٹی ہے عمر ابھی تک تو نیک نامی میں

ترے کرم سے نہ ابتک کوئی زوال آیا
کٹے نہ دن کبھی ایسا نہ ماہ و سال آیا
مگر یہ وقت پڑا سخت آزمایش کا
بہت ہے ڈر مجھے کمبخت آزمایش کا
کہیں کسی کو ذرا ایک دم قرار نہیں
اُمید پر بھی کسی کو اب اعتبار نہیں
سرشک غم ہے رواں ساری بادشاہی میں
مدد کر اب کہ ہے کشتی پڑی تباہی میں
پڑا ہے وقت کٹھن جو وہ آشکارا ہے
ترے کرم کے سوا اور کیا سہارا ہے

ترے کرم کی ہمیشہ امید رکھتا ہوں
جو سوئے گود میں تیری وہ نیند رکھتا ہوں

مدد کر اب تو مری جس سے کامیابی ہو
سفر کی راہ میں برپا نہ کچھ خرابی ہو

مِری مُراد پہ پہنچا مجھے سلامت سے
بچائیو مِرے پروردگار آفت سے

(۱۷)

فلک کے چرخ پہ روشن جب آفتاب ہُوا
سحر کے ہاتھ میں جب وقت کا حساب ہُوا

صبا نے آکے ورق کار و بار کا اُلٹا
نصیب خفتہ نے دفتر خمار کا اُلٹا

ہر اک کے ہاتھ میں گذرا حیات کا پرچا

اُٹھو اُٹھو کا ہر اک سمت ہوگیا چرچا

گری سُنہری کرن ہر طرف زمانے میں

اُجالا ہوگیا قدرت کے کار خانے میں

زمانہ کرنوں کی جگمگ سے غرقِ نور ہُوا

ہُوا اُجالا تو ظاہر قریب و دور ہُوا

زمیں پہ نقش ہُوا حرف حرف ہستی کا

کھبا نگاہوں میں عالم بلند و پستی کا

خیال رزق سے ہلچل پڑی دماغوں میں

نسیمِ فکر چلی زندگی کے باغوں میں

پڑی شعاعوں کے پڑنے سے جان ذرّوں میں
لگے پرند اُبھرنے ہَوا کے بھرّوں میں
بشر کے دل میں تر و تازگی سے جوش ہُوا
گذارا وقت جو غفلت میں اس کا ہوش ہُوا
زبانِ پاک سے تب عقل التجا کر کے
نشست گاہ سے اُٹھا خدا خدا کر کے

(۱۸)

اور آکے در پہ صدا یوں حواس و ہوش کو دی
اُٹھو اُٹھو کرو تیاریِ سفر جلدی
اُٹھو اور اُٹھ کے کرو انتظام چلنے کا
نہ آئے تاکہ کبھی وقت ہاتھ ملنے کا

ذرا سی دیر میں دن بھر خراب ہوتا ہے
کرو خیال تباں آفتاب ہوتا ہے

ورنگ صبح سے ہوتی ہے شام رستوں میں
تپش جو ہوگی تو ہوگا مقام رستوں میں

سحر کا کوچ سفر کے لئے مبارک ہے
یہ وقت آٹھ پہر کے لئے مبارک ہے

ہر ایک چیز مہیا کرو سفر کے لئے
جو کچھ کہ ہو تمھیں کرنا کرو سفر کے لئے

سویرے چلدو کہ چلنا دراز رستہ ہے
دیار غیر کا سینہ گداز رستہ ہے

خبر دو جاکے ابھی فوج بادشاہی میں
دُرست ہو کے سب آجائیں قصر شاہی میں
ہمارے شہر کے خدمت گذار جتنے ہیں
بجان شیفتۂ شہریار جتنے ہیں
جنھوں نے عمر گذاری ہے خیر خواہی میں
نہ جن کی وجہ سے بیڑا پڑا تباہی میں
ہے رزم و بزم کا جن پر مدام دار و مدار
جو ہیں فراز و نشیبِ جہاں سے واقف کار
کہو حضور میں تیار ہو کے حاضر ہوں
ذرا نہ حکم بجا آوری میں قاصر ہوں

یہ کہہ کے عقل سمایا لباس خانے میں
اور اس کے حکم سے باندھی ہوا زمانے میں

(۱۹)

حواس و ہوش جو اُس کے بڑے تھے کارگزار
بڑے دلیر - بڑے کارکن - بڑے ہشیار
یہ حکم سُن کے خبردار ہو گئے دونوں
کمر کو باندھ کے تیار ہو گئے دونوں
اُڑے ہوا سے بھی وہ تیز تر خیال کی طرح
پھرے گھڑی کی طرح وہ نہ ماہ و سال کی طرح
مثال زرد سماے گھروں میں جا جا کے
دلوں میں پڑ گئی ہل چل سی سب رعایا کے

ہر اک کا دشت کشاکش میں آب و دانہ ہُوا
ہر ایک جانب قصرِ شہی روانہ ہُوا
تمام جمع ہوئے آستانِ ملکہ پر
سب آ گئے درِ جنّت نشان ملکہ پر
درست بہرِ سفر جب تمام کام ہوئے
پرا جما کے کھڑے صف بہ صف غلام ہوئے
لباس خانہ میں تب عقل زرق برق ہُوا
وہ چاق و چست وہاں پا سے تا بہ فرق ہُوا
پھر اک سمند پہ۔ جو تھا سُبک خرام بہت
بہت سڈول۔ بہت شوخ۔ تیز گام بہت

ہرن کی طرح سے جس کا قدم اُبھرتا تھا
گھڑی میں سیکڑوں فرسنگ سے گذرتا تھا
ہُوا سوار ۔ بڑے کرّو فر کے ساتھ چلا
نصیب ٹھونک کے ۔ فتح و ظفر کے ساتھ چلا
سمند تیز ہُوا اس کا صورت صرصر
پہونچ گیا وہ درِ قصر بادشاہی پر
جب آیا عقل تو سب بخت کے غلام اُٹھے
سرِ ادب کو جُھکائے ہوئے سلام اُٹھے
وہاں جو عقل نے حاضر ہر ایک کو پایا
اُتر کے زین سے نیچے زمین پر آیا

حواس و ہوش سے اس طرح ہمکلام ہو

بتاد کار گزار و سب انتظام ہو

دیا جواب انھوں نے کہ ٹھیک ٹھاک ہے سد

ہر ایک پاؤں کو چل دینے ہی کی تاک ہے ا

کہا یہ عقل نے۔ دربار میں چلو بیٹھ

ہر ایک انجمنِ کار میں چلو بیٹھ

یہ سنتے ہی گئے دربار میں صغیر و کبر

جگہ جگہ پہ ہر اک جا کے ہو گیا جاگیر

تب آیا عقل درِ خواب گاہِ شاہی پہ

پڑی تھی نیند جہاں بسترِ تباہی

وہاں کی صبح اُداسی میں مثل شام کے تھی
پڑی خرابی وہاں ساتھ انتظام کے تھی
بہار صبح کی کُھبتی نہ تھی نگاہوں میں
شعاعیں آگ لگاتی تھیں اور آہوں میں
اُجاڑ گھر سے بھی بدتر وہاں کی رونق تھی
وہی رہا نہیں جس سے مکاں کی رونق تھی
پڑی تھی روح وہاں سوگوار بستر پر
فراقِ دل سے تھی وہ بیقرار بستر پر
گذر چکے تھے کئی روز آہ و زاری میں
تھا آب و دانہ پڑا موج اشکباری میں

جگر تھا دل کی جدائی سے درد مند اس کا
بلک کے روتی تھی - نالہ نہ تھا بلند اس کا
وہ نور چشم جو ماں کی نظر کا تارا ہو
نہ جب رہے تو کہو کس طرح گذارا ہو
غرض کہ روح کو شدھ بدھ نہ صبح و شام کی تھی
دن اور رات لگی رٹ پسر کے نام کی تھی
تباہ حال وہاں اس نے روح کو پایا
ادب کے ساتھ اکیلا محل میں عقل آیا
ادب سے کھولی پھر اس نے زبان گویائی
سحر ہوئی - ہوا وقت سریر آرائی

پڑی ہے کھلبلی قدرت کے کارخانے میں
اُٹھیں حضور کہ سب اُٹھ گئے زمانے میں
یہ سُن کے روح اُٹھی بسترِ مصیبت سے
اور آئی بزم میں شاہانہ شان و شوکت سے
سنبھل کے کرسئ زرّیں پہ آکے بیٹھ گئی
تمام بزم کی عزّت بڑھا کے بیٹھ گئی

(۲۱)

وزیرِ عقل پھر اٹھا میانِ جمِ غفیر
اور اہلِ بزم سے یوں وا کیا لبِ تقریر
نمک حلال غلامو دیارِ شاہی کے
تمھارے ہاتھ ہیں سب کاروبارِ شاہی کے

جہاں پناہ کے تم سب ہو خیر خواہوں میں

جگہ ملی ہے یہ سوچو تو کن نگا ہوں میں

زہے نصیب کہ تم خیر خواہ ملکہ ہو

شریف شہر شرافت پناہ ملکہ ہو

ہمیں جو رنج ہے دشمن کو بھی نصیب ہو

خدا کرے مرے دل کا کوئی رقیب نہ ہو

دل و جگر پہ ہر اک کے قلق گذرتا ہے

پہ کیا کریں کہ یہ سب اتفاق کرتا ہے

عبث ہے گریہ و زاری عبث ہے آہ و بکا

کوئی مٹا نہیں سکتا لکھا نصیبوں کا

ہوائے غم سے نہ برباد اپنا رنگ کرو
بہت امید میں وسعت ہے دل نہ تنگ کرو
یہاں کے کام سے غافل کبھی نہ ہونا تم
نہ بھول کر کبھی غفلت کی نیند سونا تم
نہ آئے ابتری کوئی بد انتظامی سے
نہ ہونے پائے کوئی منحرف غلامی سے
پلٹ کے آؤں نہ جب تک دیارِ شاہی میں
رہو رعیت و ملک کی خیر خواہی میں
یہ کہہ کے عقل نے تقریر ختم کی اپنی
اُٹھی جو بزم تو ہر اک نے راہ لی اپنی

(۴۴)

نا چکے تمھیں ہم کیفیت زمانے کی
ب آؤ سیر کر آئیں نگار خانے کی
مت وسیع تھا میداں نگار خانے کا
ر اصل ایک نمونہ تھا وہ زمانے کا
لہیں چمن تھا دہکتا لپٹ سے پھولوں کی
کہیں تھا باغ دکھاتا بہار جھولوں کی
بچھا تھا فرش کہیں سبز سبز گھاسوں کا
جہاں مزاج بہل جاتا تھا اُداسوں کا
کہیں کہیں نظر آتا تھا جھنڈ کیلوں کا
لئے ہوں جیسے سپاہی ہرا ہرا جھنڈا

بڑے بڑے تھے شجر پیپل اور برگد کے

کھڑے تھے دشت میں گویا کہ شرط بد بد کے

تھے اونچے اونچے بہت سے درخت تاڑوں کے

کھڑے تھے ایسے کہ ٹیلے ہوں کچھ پہاڑوں کے

کہیں کہیں تھی شفا بخش چھاؤں نیموں کی

جہاں نہ ہوتی تھی حاجت کبھی حکیموں کی

گھنا تھا پتّوں سے ہر ایک سایہ دار درخت

لدا پھلوں سے تھا ہر ایک باردار درخت

کہیں تھیں نہریں - کہیں پوکھرے - کہیں تالاب

تھے پودے جن سے کہ سرسبز اور زمیں شاداب

کسی مقام پہ مشکل گذار جنگل تھا
کہیں گھنا تھا۔ کہیں خار وار جنگل تھا
فلک نما تھے ہزاروں درخت ساکھو کے
قلانچے تھے جہاں آکے جھنڈ آہو کے
جمے ہوئے تھے وہاں جا بجا ببول بہت
بکھر گئے تھے جہاں گر کے زرد پھول بہت
زمین سبزی سے ہر سو ہری تھی جنگل کی
چمن سے کم نہیں کچھ سبزی تھی جنگل کی
طرح طرح کے تھے واں طائران خوش الحان
چہک چہک کے دکھاتے تھے جو خدا کی شان

تھے سبز طوطے کہیں جن کے سرخ سرخ تھے ٹھور

دکھاتے کوّے کہیں اپنے اتفاق کا زور

کہیں درختوں سے اوکھڑ دیکھ کچھ دکھائی تھی

کہیں پپیہے کی آواز دل ہلاتی تھی

کہیں سے آتی تھی پُر درد کوک کوئل کی

جگر پکڑ کے سُنے ہر دو کوک کوئل کی

بعشق ماہ کہیں آگ پھانکتا تھا چکور

گھٹا کو دیکھ کے جنگل میں ناچتا تھا مور

عجب بہار دکھاتا تھا پُر فضا میدان

رہے نہ دیکھ کے جس کو بہشت کا ارماں

ہر ایک سمت عیاں تھا کرشمہ قدرت کا
ہر ایک شے سے ٹپکتا تھا حُسن فطرت کا

(۲۴)

لگا تھا دشت میں نیرنگ شاہ کا اجلاس
کسی کو لگتی تھی دہشت سے اسکی بھوک نہ پیاس
مقدمے تھے وہاں پیش عشق بازوں کے
حضور شاہ میں دفتر کُھلے تھے رازوں کے
ہر ایک شخص کی روداد شاہ سُنتا تھا
ہر ایک کے لئے واجب سزا وہ چُنتا تھا
ہر اک گھڑی وہاں تازہ شگوفہ کِھلتا تھا
نتیجہ فعل کا اپنے ہر اک کو مِلتا تھا

(خاتمہ)

نگار خانہ کی اب ختم سب بہار ہوئی

حضور شاہ دلِ زار کی پکار ہوئی

اخیر حکم سنانے کو پھر اجل آئی

سزائے موت دلِ نامراد نے پائی

وزیر عقل اسی درمیاں میں آپہونچا

وہ دل کو باغ و بیاباں میں ڈھونڈھتا پہونچا

یہ حال دیکھ کے وہ بحر غم میں ڈوب گیا

اور اس کے ساتھ ہی عبرت کا بھی پتہ نہ

احمد صدیق مجنوں بی اے گورکھپوری نے
آسی پریس گورکھپور میں چھپوا کر
دفتر ایوان اشاعت گورکھپور سے شایع کیا